Part-1 

امام الصوفیہ حضرت سید علی ہجویری نور اللہ مرقدھم

مفتی منیب الرحمٰن

امام الصوفیہ حضرت ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسن کے توسط سے امام الاولیاء و امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ آپ کا عہد مشہور روایات کے مطابق 400ھ تا 465ھ ہے، آپ کا مزار پرانوار 24 گھنٹے مرجعِ خلائق رہتا ہے۔ تصوف بنیادی طور پر صفائے قلب اور روح کی جلا کا نام ہے۔ اسے قرآن وحدیث میں تزکیہ، احسان اور عرفان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت سید علی ہجویری نے صوفیہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مُستَصوِف، وہ لکھتے ہیں:

(۱) صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہوکر حق کے ساتھ باقی ہوگیا ہو، نفسانی خواہشات اور ان کے تصرف سے آزاد ہوکر حقیقت الحقائق یعنی اللہ تعالیٰ سے واصل ہوگیا ہو، (۲) متصوف وہ ہے جو مجاہدے اور ریاضت کے ذریعے اِس مقام کے حصول کے لیے کوشاں ہے اور راہ حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو صوفیہ کے طریقے پر کاربند رکھتا ہے، (۳) مُستَصوِف وہ ہے جو دنیوی منفعت کے حصول اور جاہ ومرتبے کی لالچ میں صوفیہ کی نقالی کررہا ہو، اسے نہ تو اوپر والے دونوں گروہوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی اسے طریقت کے بارے میں کوئی ادنیٰ سی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مشائخ کرام نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''مُستَصوِف صوفیہ کے نزدیک مکھی کی مانند ہے اور غیر صوفیہ (عوام) کے لیے بھیڑیا ہے''۔ صوفیائے کرام مُستَصوِف کو مکھی سے اس لیے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ صوفیہ کی نقالی ہوا وہوس کی خاطر کرتے ہیں جیسے مکھی کسی چیز پر بھنکتی رہتی ہے اور عوام کے حق میں اس لیے بھیڑیے ہیں کہ بھیڑیے کا کام بھی چیرنا پھاڑنا اور مردار کھانا ہے، یعنی ناجائز طریقے، حیلے اور مکروفریب سے مفادات سمیٹنا ہے۔ الغرض صوفی صاحبِ وصول ہوتا ہے اور متصوف واصل باللہ ہوتا ہے اور مُستَصوِف صاحبِ فصول یعنی ذات حق تعالیٰ اور راہ حق سے دور ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال ہوا: ایک شخص شریعت کا عامل نہیں ہے، اَحکام شریعت کا تارک ہے، اُس کا مؤاخذہ کیا جائے تو کہتا ہے: ''اَحکام شریعت تو وصول اللہ کا ذریعہ ہیں اور میں تو واصل ہوچکا ہوں، یعنی منزل حق پر پہنچا ہوا ہوں، لہٰذا میں اب اَحکام کے لیے جواب دہ نہیں ہوں، اُنہوں نے جلیل القدر ائمۂ تصوف کے حوالے سے لکھا: ''ہاں! واصل (پہنچا ہوا) تو ضرور ہے، مگر جہنم میں''، مزید لکھتے ہیں: ''صوفیہ کرام فرماتے ہیں: بے علم صوفی شیطان کا مسخرہ ہے، اُس کی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں ہے، وہ اُسے اپنی راہ پہ چلاتا ہے، حدیث میں ہے: ''بغیر فقہ کے عابد بننے والا ایسا ہے، جیسے چکی میں گدھا، کہ محنت شاقہ کرے اور حاصل کچھ نہیں''۔

حضرت سید علی ہجویری مزید لکھتے ہیں:

''صوفیہ سے متعلق آج کل یہ مصیبت عام ہوگئی ہے، ملحدین کے ایک گروہ نے جب حقیقی صوفیہ کی شان اور قدر و منزلت دیکھی، تو اپنے آپ کو بھی ان کا ہم شکل بنالیا اور کہنا شروع کر دیا کہ طاعات و عبادات کی تکلیف اس وقت تک ہے، جب تک معرفت حاصل نہیں ہو جاتی۔ جب معرفت حاصل ہوگئی تو عبادات و طاعات کی تکلیف جسم سے اُٹھ جاتی ہے (یعنی انسان اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کے احکام اور شریعت کا پابند نہیں رہتا)''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اسلام کی قرونِ اُولیٰ اور قرونِ وُسطیٰ تک حقیقی صوفیہ کرام کا حلیہ اختیار کرنا طریقت کے نام پر سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دامِ عقیدت میں پھنسانے کا ایک حربہ تھا، ورنہ آج کل اس طرح کے کسی تکلف کی بھی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے اور نہ ہی ظاہری اعتبار سے تدیُّن اور تشرُّع کی صورت اختیار کرنے کا تکلف کیا جاتا ہے، ہر قسم کا شکار خود ہی شکاری کے جال میں پھنسنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے، علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے:

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں   کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

حضرت سید علی ہجویری نے بتایا: روحانی ارتقاء کی راہ میں دو چیزیں حائل ہوتی ہیں: ایک ''رَین'' اور دوسری ''غَین''۔ دراصل قلبی اور روحانی خرابیوں میں ایک تو کفر، شرک اور نفاق ہے اور اس کے سبب انسان کے دل و دماغ پر ہدایت کے انوار و تجلیات کا فیضان مستقل طور پر رک جاتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: حجاب کی دو قسمیں ہیں: ایک ''رینی'' اور یہ کبھی نہیں اٹھتا، وہ مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بعض لوگوں کی ذات خود حق سے حجاب کا سبب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے نزدیک حق اور باطل یکساں ہو جاتا ہے۔ اسی حجاب کو ''رین'' کہتے ہیں اور قرآن مجید میں اسے ختم، طبع، اِغفال (غافل کرنا)، اَکِنّہ (دل پر ظلمتوں کا غلاف چڑھ جانا) اور قساوت (سنگ دلی) سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہیں، بلکہ ان کے کرتوتوں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے، (المطففین: 14)''۔ یہ لوگ ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں اور ہدایت سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اُنہوں (کافروں) نے کہا: آپ ہمیں جس دین کی طرف بلا رہے ہیں، اُس کی (قبولیت کی راہ میں) ہمارے دلوں پر پردے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے، (حٰم السجدہ: 05)''۔

دوسری قسم کے حجاب کو ''غین'' کہتے ہیں۔ دراصل یہ انسان کے دل میں حرص و طمع، بُخل، ہوا و ہوس، حسد، کِبر و نخوت، ریا اور دیگر اَخلاقی اَمراض ہوتے ہیں، جن کے سبب انسان کے دل پر پردہ پڑ جاتا ہے، مگر یہ حجاب عارضی ہوتا ہے اور توبہ و استغفار سے زائل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میرے دل پر کبھی (انوار کے غلبے سے) اَبر چھا جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، (صحیح مسلم: 42)''۔ بعض شارحین نے لکھا ہے: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سید المرسلین ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کے ارتقا کا سفر جاری رہتا ہے اور جب آپ ﷺ اپنے اگلے مقامِ رفیع سے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں، تو ایک غبار سا چھا جاتا ہے اور مقامِ نبوت کے حوالے سے اسی کو ''غین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''رین'' کی مثال وطن کی سی ہے، جو مستقل ہوتا ہے اور ''غین'' سے وہ خیالات و خطرات ہیں، جو دل پر طاری ہوتے ہیں اور کبھی دل میں جگہ بھی پا لیتے ہیں، لیکن توبہ و استغفار سے ان کے اثرات مٹ جاتے ہیں۔

حدیثِ پاک میں مرتبۂ احسان کو ان کلمات میں بیان فرمایا گیا ہے: ''(احسان یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس قدر حضوریٔ قلب

(Presence of Mind) سے کرو کہ گویا تم اللہ عزّ وجلّ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم (اپنی نارسائی کے سبب) اسے نہیں دیکھ پاتے، تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے، (صحیح بخاری:50)''۔ چنانچہ حضرت سید علی ہجویری اسی مقام احسان کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے حاتمِ اَصَم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: آپ نماز کس طرح ادا فرماتے ہیں؟، انہوں نے جواب دیا: جب نماز کا وقت آتا ہے، تو پانی سے ظاہری وضو کرتا ہوں (یعنی اس سے اعضائے وضو کی پاکیزگی حاصل کرتا ہوں) اور توبہ کے ذریعے باطنی وضو کرتا ہوں، یعنی توبہ سے قلب وروح کی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے وقت خانۂ کعبہ کو اپنے سامنے، مقام ابراہیم کو دونوں ابرووٴں کے درمیان، بہشت کو دائیں، دوزخ کو بائیں، پلِ صراط کو قدموں کے نیچے اور فرشتۂ موت کو اپنے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ اس کے بعد اللہ کی عظمت وجلالت کو اپنے ظاہر وباطن پر طاری کر کے اللہ اکبر کہتا ہوں، اعزاز ووقار کے ساتھ قیام کرتا ہوں، قراءت کے وقت اللہ کی ہیبت دل پر طاری رہتی ہے، تواضع اور انکسار کے ساتھ رکوع اور انتہائی تضرُّع اور عاجزی کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں، حلم ووقار کے ساتھ قعدہ کر کے شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں''۔

جنت کو دائیں اور دوزخ کو بائیں رکھنے کی حقیقت کو اس قول میں بیان کیا گیا ہے: ''ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے''، یعنی حقیقتِ ایمان اور کمالِ ایمان یہ ہے کہ انسان کے دل پر خشیت وہیبتِ الٰہی بھی طاری ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عفو ومغفرت پر اس کا یقین بھی مرتبۂ کمال پر ہو، اسی کو وعظ وتذکیر کے عنوان پر مجموعۂ احادیث میں ترغیب وترہیب اور رغبت ورہبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرشتۂ اَجل کو پیچھے تصور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو ہر آن موت کے لیے تیار رہنا چاہیے اور پل صراط کو سامنے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے جادۂ مستقیم پر ایک ایک قدم ہزار بار سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے، ورنہ ذرا سی بے احتیاطی اور لغزش سے انسان گھرے ظلمت کدے میں گر سکتا ہے یا جہنم کا ایندھن بن سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔

آخر میں ایک حدیث پاک کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب قومی خزانے کو ذاتی جاگیر بنالیا جائے اور امانت کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹا جائے اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھ کر دینے سے انکار کیا جائے اور دین کا علم دنیا کمانے کے لیے حاصل کیا جائے اور ایک شخص اپنی بیوی کا فرمانبردار اور اپنی ماں کا نافرمان بن جائے اور ایک شخص اپنے دوست کو قریب کرے اور باپ کو دھتکار دے اور مسجدوں میں شور وغوغا ہونے لگے اور قبیلے (یا قوم) کی سیادت بدکار شخص کرے اور قومی معاملات کی ذمے داری کمینے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے اور معاشرے میں کسی شخص کی عزت (اس کے تقوے یا علم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ) اس کے شر سے بچنے کے لیے کی جائے اور آلاتِ غِنا اور مغنّیات کا دور دورہ ہو اور شراب نوشی عام ہو جائے اور اس امت کے بعد والے اپنے پہلوؤں پر لعنت کرنے لگیں، تو (اچھے دنوں کی تمنا تو دور کی بات ہے) تم اس وقت کا انتظار کرو جب سرخ ہوائیں چلیں گی، زلزلے آئیں گے، زمین میں دھنسا دیے جاؤ گے، صورتیں بگاڑی جائیں گی، آسمان سے سنگ باری ہوگی اور قربِ قیامت کی نشانیاں اس تسلسل سے آئیں گی، جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہو اور دانے ایک ایک کر کے گر رہے ہوں، (سنن ترمذی:2211)''۔